بند کواڑوں کے آگے

عمیرہ احمد

بند کواڑوں کے آگے

میں نے پہلی بار اسے گورنمنٹ کالج کے ایک فنکشن میں دیکھا تھا۔ وہ اسٹیج سیکرٹری تھی اور ہر شخص، ہر چیز پر حاوی سی لگ رہی تھی۔ گفتگو کے فن سے آشنا تھی اور آواز کی خوبصورتی اپنی جگہ تھی۔

میں نے اسے بہت قریب سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ایسی کوئی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اس وقت انٹر میں نیا نیا داخلہ لیا تھا اور وہ وہاں گریجویشن کی طالبہ تھی۔ یہ ضرور تھا کہ پہلی بار کوایجوکیشن میں آنے کے بعد میں لڑکیوں سے کچھ خائف تھا لیکن اس وقت جس عمر میں تھا قدرتی طور پر مجھے صنف مخالف میں کافی دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔

لیکن بہرحال مجھے اس سے متاثر ہونے کے باوجود اس کے پاس جانے یا ملنے کا شوق نہیں ہوا۔ وجہ بالکل واضح تھی، مجھے اس وقت لڑکیوں میں جو چیزیں اٹریکٹ کرتی تھیں ان میں سے کچھ بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ نہ اس کے نین نقش تیکھے تھے، نہ بال لمبے تھے، نہ

رنگت چاند کی طرح تھی، نہ دانت موتیوں جیسے تھے، نہ چال ہرنی جیسی تھی، نہ ہی وہ فیشن ایبل تھی۔ ہاں مگر اس کا قد بہت دراز تھا۔ اس فنکشن میں، میں بس دور سے اتنا ہی دیکھ سکا تھا۔

میں کوئی علامہ قسم کا اسٹوڈنٹ بھی نہیں تھا جو اس کے انداز گفتگو میں خوبصورت الفاظ کے انتخاب سے متاثر ہو جاتا سو بس چند گھنٹے وہاں گزارنے اور اس کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ اس فنکشن پر تبصرہ کرتا ہوا میں واپس گھر آ گیا تھا۔ رابیل علی سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

کالج میں داخلہ لینے کے چند ماہ بعد ہی جونیئر ورلڈ کپ میں حصہ لینے والی پاکستانی ٹیم میں میرا انتخاب ہوگیا تھا۔ اور تعلیم سے میری توجہ بالکل ہی ہٹ گئی تھی۔ اس زمانہ میں کرکٹ ہی میرے لیے سب کچھ تھی۔ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ میری فیملی بہت امیر نہیں تھی لیکن بہرحال ہم کھاتے پیتے لوگوں میں شمار ہوتے تھے، خاص طور سے جب سے میرے بڑے دونوں بھائی بھی کمانے لگے تھے تب سے ہماری مالی پوزیشن کافی اچھی ہوگئی تھی۔

شروع میں گھر والوں نے مجھے کرکٹ کھیلنے سے منع کرنے کی کافی کوشش کی تھی لیکن بہرحال میں ان کی چالوں اور باتوں میں نہیں آیا۔ کرکٹ میرا شوق نہیں، جنون تھا اور اس جنون نے گھر والوں کو بھی اپنے حصار میں لے ہی لیا تھا۔ کلب کرکٹ کھیلتے کھیلتے جب اچانک میری سلیکشن انڈر 19 ٹیم کے لیے ہوگئی تو میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی بہت خوش تھے۔

پھر میں جونیئر ورلڈ کپ کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ پاکستان کی مجموعی پرفارمنس وہاں پر زیادہ بہتر نہیں رہی لیکن جن چند کھلاڑیوں نے بین الاقوامی میڈیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی تھی ان میں، میں بھی تھا۔ پتا نہیں کون کون سے خطاب تھے جو مجھے دے دیے گئے تھے۔ مجھے پاکستان کی باؤلنگ کا مستقبل قرار دے دیا گیا تھا اور میں جیسے ان پچیس دنوں میں مستقل ہواؤں میں رہا تھا۔ گمنامی سے ایک دم دنیا کے سامنے آنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی چمگادڑ یک دم سورج کے سامنے آجائے۔

میں خوبصورت اور کم عمر تھا۔ ٹیلنٹڈ تھا اور مجھے ان سب چیزوں کا احساس تھا۔ جونیئر ورلڈ کپ کے اختتام کے ساتھ ہی انگلینڈ میں لیگ کرکٹ میں حصہ لینے والے ایک کلب کے

ساتھ میرا معاہدہ ہو گیا تھا۔ اور پھر چند ہی ماہ میں مجھے بہت سے ملکوں کی جونیئر ٹیموں کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ میں پاکستان کی جونیئر ٹیم کا ایک مستقل رکن بن گیا تھا۔

مجھے یاد ہے جب میں دوبارہ یونیورسٹی آیا تھا تو تقریباً آٹھ ماہ گزر گئے تھے۔ کالج سے میرا نام خارج نہیں کیا گیا تھا، وجہ صرف کرکٹ ہی تھی اور میں جانتا تھا کہ اب میں ایک دوسرا احسن منصور ہوں۔ کالج میں میری بہت زیادہ شناخت نہیں ہوئی تھی کیونکہ ظاہر ہے ایک جونیئر ٹیم کا کھلاڑی لائم لائٹ میں اس طرح نہیں رہتا جس طرح سینئر کھلاڑی رہتے ہیں مگر جتنی شہرت اور شناخت مجھے حاصل تھی میں اس پر بھی خوش تھا۔ اب میرا چہرہ ایک عام چہرہ نہیں رہا تھا۔ میں خود کو دوسروں سے منفرد اور ممتاز سمجھنے لگا تھا خاص طور پر لڑکیوں میں میری مقبولیت بڑھ گئی تھی۔ یا کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا تھا۔

مجھے یاد ہے چند ماہ بعد میں نے ایک صبح اخبار میں رابیل علی کی تصویر دیکھی تھی۔ اس نے BA میں ٹاپ کیا تھا اور اس کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے وہ فنکشن یاد آ گیا تھا جس میں، میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں کچھ مرعوب سا ہوا تھا آخر BA میں ٹاپ کرنا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی لیکن یہ احساسات صرف کچھ دیر کے لیے ہی تھے۔ میں جلد ہی اسے ایک بار پھر بھول گیا تھا۔ ان ہی دنوں آسٹریلیا کا ٹور کرنے والی پاکستانی ٹیم کے لیے میرا انتخاب کیا گیا تھا اور میں جیسے خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔

میں صرف سترہ سال کا تھا اور اس عمر میں یک دم پاکستانی کرکٹ ٹیم میں بغیر کسی سفارش کے آ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ مبارکبادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو شروع ہو گیا تھا۔ اگلے دن یونیورسٹی میں بھی میں سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا یہاں تک کہ کچھ اساتذہ نے بھی مجھے کلاس میں ہی مبارکباد دی تھی۔

پھر میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کا ٹور کرنے والی ٹیم کے ساتھ چلا گیا اور میرے کیریئر کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کون سی طاقت تھی لیکن بہرحال میرا ہر پانسہ سیدھا ہی پڑتا رہا۔ میں صرف ایک باؤلر تھا لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ بیٹنگ میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بھی میری پرفارمنس اس میں بھی شاندار رہی تھی۔ جہاں سپر اسٹارز فلاپ ہونا شروع ہوتے وہاں کبھی میری بیٹنگ رنگ جمانے لگتی اور کبھی میری باؤلنگ

اپنی دھاک بٹھانے لگتی۔

جب ان دونوں سیریز میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میں پاکستان واپس لوٹا تھا تو میری گردن کے کلف میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ میری باتوں کا انداز بدل چکا تھا کیونکہ میں بدل چکا تھا۔ ہر ماہ گھر والوں سے پانچ چھ سو جیب خرچ لینے والے کے پاس اب اتنے پیسے تھے کہ وہ گھر والوں پر ڈھیروں روپے خرچ کر سکے۔ اخبارات میں میری پرفارمنس پر خصوصی کالم لکھے جا رہے تھے۔ اسپورٹس میگزین مجھ پر خصوصی ضمیمے نکال رہے تھے۔ مختلف ڈیپارٹمنٹس کی طرف سے مجھے اپنے لیے کھیلنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ میں اب اسٹار آل راؤنڈرز کی صف میں شامل ہو گیا تھا اور اس سب کے لیے مجھے نہ سالوں کی محنت کرنی پڑی تھی نہ کوئی طویل جدوجہد۔

پاکستان واپس آنے کے بعد جب میں دوبارہ کالج گیا تھا تو مجھے دیکھتے ہی جیسے ہر ایک حیران ہو جاتا تھا۔ آٹوگرافس لینے والوں کا ایک بڑا ہجوم تھا جس نے مجھے پہلے دن اپنے گھیراؤ میں رکھا اور ظاہر ہے اس میں لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ اور میں یقیناً زندگی میں یہی سب کچھ چاہتا تھا۔ میں اب لڑکیوں سے پہلے کی طرح خائف نہیں تھا۔ بیرونی دوروں نے صنف نازک کے سامنے میری گھبراہٹ کو ختم کر دیا تھا۔ اب میں ان کے تبصروں کے جواب اتنے ہی شوخ انداز میں دیتا تھا۔ لیکن اب کالج میرا آنا جانا کافی کم ہو گیا تھا میں صرف خانہ پری کے لیے ہی کبھی کبھار وہاں جاتا تھا ورنہ مجھے نہ تو تعلیم میں پہلے کوئی دلچسپی تھی نہ ہی اب تھی بس میرے والدین کا اصرار تھا کہ میں گریجویشن ضرور کرلوں چاہے تھرڈ ڈویژن میں ہی سہی اور میں نے ان کے اصرار پر سر جھکا دیا تھا۔

رابیل علی سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات تب ہوئی تھی جب کالج نے اپنے ایک سالانہ فنکشن میں کچھ نامور لوگوں کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا۔ وہ اب کے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ایم اے انگلش کی طالبہ تھی اور اس فنکشن میں ایک بار پھر اسٹیج سیکرٹری کے طور پر سامنے آئی تھی لیکن پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگوں میں بہت پاپولر ہے۔

میرے کچھ دوستوں نے مجھے اس فنکشن کا آغاز ہونے سے پہلے ہی اس کے بارے میں خبردار کیا تھا کہ وہ بہت تیکھے سوال کرتی ہے اور زیادہ تر مدمقابل کو لاجواب کر

چھوڑتی ہے لیکن جو عجیب بات مجھے اپنے دوستوں کے رویے میں محسوس ہوئی تھی وہ رابیل کے لیے احترام تھا۔ میرے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو لڑکیوں کے بارے میں تبصرے کرتے ہوئے محتاط رہتا مگر رابیل کے بارے میں وہ بڑے محتاط انداز میں بات کر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ لاشعوری طور پر اس سے مرعوب تھے۔

مجھے ان کے رویے پر کافی حیرانگی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے میں نے بڑی لاپرواہی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن میرے دوست عمر نے کہا تھا:

''دیکھیں گے تم بھی کتنے پانی میں ہو۔ اس کے سامنے ساری چوکڑیاں نہ بھول جاؤ تو میرا نام بدل دینا۔''

رابیل کے بارے میں اس جملے نے میرے تجسس اور تشویش دونوں کو بڑھا دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پروگرام کے آغاز سے پہلے میں اس سے ملوں اور پوچھوں کہ وہ مجھ سے کس قسم کے سوالات کرے گی اور جب میں نے اپنے دوستوں سے اس بات کا اظہار کیا تو عجیب سا رسپانس انھوں نے دیا تھا۔ عمر نے کندھے اچکائے تھے۔ حسن نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکوڑے تھے۔ عادل جھینپی سی ہنسی ہنسنے لگا تھا۔

یک دم مجھے احساس ہوا کہ وہ سب اس کے پاس جانے سے گھبرا رہے تھے۔ ایسے جیسے وہ بے حد کنفیوز ہو گئے تھے۔ لیکن بہر حال وہ میرے ساتھ اس کے پاس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ پھر کچھ دیر کے بعد میں رابیل علی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اس فنکشن کے انچارج سر عمانوئیل اور چند دوسرے اسٹوڈنٹس کے ساتھ کھڑی کچھ پیپرز دیکھ رہی تھی اور شاید کسی موضوع پر کچھ بحث بھی ہو رہی تھی۔

سر عمانوئیل نے مجھے دور سے دیکھ لیا تھا اور وہ تیزی سے میرے پاس آئے تھے۔ بڑی گرم جوشی سے انھوں نے میرا حال احوال پوچھا تھا اور فنکشن میں آنے کے لیے شکریہ ادا کیا تھا پھر وہ مجھے میری نشست پر لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں رابیل علی سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں اگر وہ اسے میرا پیغام دے دیں تو میں ان کا بہت مشکور ہوں گا۔ وہ مسکراتے ہوئے رابیل کے پاس چلے گئے تھے۔ اور چند لمحے بعد میں نے رابیل اور اس کے ساتھ کھڑے دوسرے لڑکوں کو اچانک اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھا۔ وہ ان پیپرز کو

رول کرتی ہوئی میری طرف آ گئی تھی اور پتا نہیں کیوں لیکن مجھے لگا تھا کہ میں اتنا ہی کنفیوز ہوں جتنے میرے دوست ہیں۔ میرے پاس آ کر اس نے مسکراتے ہوئے مجھے وش کیا تھا:

''سر عمانوئیل کہہ رہے تھے کہ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔''

اس نے بغیر کسی توقف کے مجھ سے پوچھا اور یک دم مجھے لگا کہ میرا سارا اعتماد رخصت ہو گیا ہے لیکن بہر حال اپنی ساری ہمت کو اکٹھا کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا:

''وہ اصل میں میرے دوست کہہ رہے تھے کہ آپ اسٹیج پر اپنے سوالوں اور باتوں سے بہت پریشان کرتی ہیں۔''

اس کے چہرے پر میری بات سن کر حیرانگی کے تاثرات نمودار ہوئے تھے لیکن پھر اس نے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ میرے دوستوں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کے کون سے دوست کہہ رہے ہیں کہ میں اسٹیج پر اپنے سوالوں سے پریشان کرتی ہوں؟''

میں نے عمر کی طرف اشارہ کیا تھا اور مجھے لگا تھا جیسے عمر وہاں سے دوڑ لگا دے گا کم از کم اس کے چہرے سے مجھے ایسا ہی لگا تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے براہ راست عمر سے ہی پوچھا تھا۔

عمر کا نام جاننے کے بعد اس نے کہا تھا:

''دیکھیں عمر! میں پریشان کرنے والے سوال نہیں کرتی، میں اچھے سوال کرتی ہوں تا کہ ان کے جواب بھی اچھے اور منفرد ملیں اور جو لوگ پروگرام دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ اسے انجوائے کریں۔ اگر وہی اسٹیریو ٹائپ سوال پوچھے جاتے رہیں تو مجھے نہیں لگتا کہ کسی کو اس بات میں دلچسپی ہو گی کہ وہ مہمانوں کے ساتھ میری باتیں سنیں لیکن بہر حال میں کبھی بھی اپنے پروگرامز میں حصہ لینے والوں کو پریشان کرنا نہیں چاہوں گی اور آج کا پروگرام دیکھنے کے بعد آپ ضرور مجھے بتائیے کہ میں نے کون سا سوال ایسا کیا تھا جو پریشان کرنے والا تھا یا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

وہ بڑی نرمی سے مجھے نظر انداز کیے ہوئے عمر سے مخاطب تھی جو زمین پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔

میں نے آج تک اسے کبھی کسی لڑکی کے سامنے نظریں جھکائے نہیں دیکھا تھا لیکن آج میں نے دیکھ ہی لیا تھا۔ وہ عمر سے بات کرنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو ہم سب کو آپ پر بہت فخر ہے۔ ہمارے کالج کو آپ پر ناز ہے کیونکہ آپ بہترین پلیئر ہیں اور میں نہیں سمجھتی کہ آپ کو کوئی خدشہ ہونا چاہیے۔ آپ گراؤنڈ میں اتنے کانفیڈنٹ نظر آتے ہیں تو یقیناً اسٹیج پر بھی ہوں گے اور میں کوشش کروں گی کہ بقول عمر کے کوئی پریشان کرنے والا سوال نہ کروں۔ میرے خیال میں اتنی یقین دہانی کافی ہے ناؤ ایکسکیوزمی مجھے کچھ کام ہے۔''

وہ معذرت کرتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔ میں ان چند لمحوں میں مکمل طور پر اس کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ بلیک اور وائٹ چیک کی شرٹ میں ملبوس تھی۔ بلیک شلوار کے ساتھ اس نے بلیک دوپٹہ لیا ہوا تھا اور جینز کی بلیک جیکٹ کی آستینیں اس نے کہنیوں تک الٹ رکھی تھیں اس کی بائیں کلائی میں ایک رسٹ واچ تھی اور دوسری کلائی بالکل خالی تھی۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور اسٹیپس میں کٹے ہوئے کھلے بالوں میں اس نے ایک ہیئر بینڈ لگا رکھا تھا۔

وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی مگر اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ دونوں یقیناً خوبصورت تھیں۔ اس کی آنکھیں بہت چمکدار اور بچوں کی طرح شفاف تھیں یقیناً اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی جو دوسروں کو مرعوب کر دیتی تھی شاید اس کا اعتماد، شاید اس کا انداز گفتگو، شاید اس کی آواز یا شاید یہ سب کچھ...... میں بہرحال کافی متاثر ہوا تھا۔

اور اس دن اسٹیج پر جا کر میں واقعی اپنی ساری چوکڑی بھول گیا تھا۔ اس کے سوال بہت تیکھے تھے اور ان کے پوچھنے کا انداز اس سے بھی سوا تھا۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ ہال میں سے آنے والے ریمارکس تھے اور تالیوں اور قہقہوں کا ایک شور تھا جو اس کے ہر سوال پر ہال میں بلند ہوتا تھا۔ مجھے اسٹیج پر بلانے سے پہلے وہ چند دوسرے مہمانوں سے باتیں کرتی رہی تھی اور اس نے ان سے بھی کافی مشکل اور دلچسپ سوال پوچھے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی میری طرح نروس نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ کافی میچور عمر کے تھے لیکن بہرحال میں اپنی اس خود اعتمادی کا کوئی مظاہرہ نہیں کر سکا جس کے لیے میں مشہور تھا۔ میں ایک ہی رات میں جیسے سپر اسٹار سے **laughing stock** بن گیا تھا۔

وہ اسٹیج پر مجھے اس ننھے بچے کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی جس کے ہاتھوں میں کھلونوں کا ایک ڈھیر ہو اور وہ اسے سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہوا جا رہا ہو۔ اس نے میرے ہیئر اسٹائل سے لے کر میرے کھیل اور میری تعلیمی دلچسپیوں سے لے کر میرے گھر آنے والی فون کالز تک کو موضوع بحث بنایا تھا۔ میں اس کے ہر سوال پر بوکھلاتا، کبھی کھسیانی ہنسی ہنستا، کبھی جھینپتا اور جب کبھی اپنی طرف سے معقول جواب دینے کی کوشش کرتا تو ہال سے آنے والی کوئی آواز یا رابیل علی کا کوئی تبصرہ میرے اس جواب کی معقولیت کو یک دم زائل کر دیتا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس نے میرے لیے بلکہ سارے مہمانوں کے لیے کافی ہوم ورک کیا تھا اور شاید ہال میں بھی اس نے کچھ لوگوں کو کچھ جملے رٹا رکھے تھے جو بروقت بولے جاتے تھے۔

میں اس انٹرویو کے اختتام تک بالکل ہمت ہار چکا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ مختلف ڈیپارٹمنٹس باقاعدہ پلاننگ سے میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے تھے کیونکہ ہال میں سے جتنے تبصرے مجھ پر کیے گئے تھے۔ وہ ساری آوازیں وہاں سے آتی رہی تھیں جہاں ایم اے کے اسٹوڈنٹس بیٹھے تھے۔ لیکن بہر حال میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ لوگ جیسے مجھے فرسٹ ائیر فول سمجھ کر چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے اور میں سب سننے پر مجبور تھا۔

لیکن پتا نہیں کیوں اس دن واپس گھر آ کر میں جب سونے کے لیے لیٹا تو مجھے چند گھنٹے پہلے کی یہ ساری آپ بیتی اتنی بری نہیں لگی۔ رابیل علی سے مرعوبیت اور بھی بڑھ گئی تھی کیونکہ اس دن پہلی بار میں نے اسے اردو اور انگلش میں بولتے بلکہ خوب بولتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے دونوں زبانوں میں یکساں مہارت تھی اور میں دونوں میں سے کسی پر بھی عبور نہیں رکھتا تھا۔

اس رات میں بہت دیر تک رابیل علی کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور زندگی میں پہلی بار میں نے کسی لڑکی کی ظاہری خوبصورتی کی بجائے اس کی ذہانت اور حاضر دماغی کے بارے میں سوچا تھا۔ اس وقت مجھے اس کے سوالوں کے بہت مناسب جواب سوجھ رہے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے کوئی بھی ایسا سوال نہیں کیا تھا جس کا جواب نہ دیا جا سکتا ہو لیکن اب اس کا فائدہ نہیں تھا کیونکہ جواب دینے کا وقت گزر چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔

جیسے میں اس کے لیے ایک ننھا بچہ تھا جسے وہ بہلا کر اپنی اور دوسروں کی انجوائے منٹ کا سامان کر رہی ہو۔

جب سے میں پاکستان کرکٹ ٹیم میں آیا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھے اتنی غیر سنجیدگی سے لیا تھا۔ یہ درست تھا کہ میں کافی کم عمر تھا لیکن بہرحال اپنے قد و قامت سے میں کسی طور بھی ٹین ایجر نہیں لگتا تھا اور نہ ہی مجھے یہ بات پسند تھی کہ مجھے ٹین ایجر کے طور پر ٹریٹ کیا جاتا۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا مگر اس فنکشن کے بعد میں نے باقاعدہ طور پر کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ کلاسز میں کم ہی اٹینڈ کرتا ہاں انگلش ڈیپارٹمنٹ کا چکر ضرور لگایا کرتا تھا وجہ صرف رابیل علی تھی۔ وہاں اکثر میرا اس سے سامنا ہو جاتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس نے کبھی بھی مجھ سے سلام دعا میں پہل نہیں کی تھی۔ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ ہوتی اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ اور وہ اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال کر گزر جانے کی کوشش کرتی اور میں ہمیشہ پہل کرتے ہوئے اس سے ہیلو ہائے کرتا۔ وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جواب دیتی اور میرے ساتھ مزید گفتگو کرنے کی بجائے پاس سے گزرتی چلی جاتی۔

شروع میں مجھے اس کے اس رویے سے عجیب سی خفت کا احساس ہوا تھا کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے لڑکیوں سے سلام دعا میں پہل کرنی پڑی ہو یا کسی نے اس طرح سرسری انداز میں میرے سلام دعا کا جواب دیا ہو، جیسے اہم شخص میں نہیں وہ ہو۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر ایسا کرتی تھی تاکہ میں یہ سمجھ کر کہ وہ بڑی منفرد لڑکی ہے اس کی طرف مزید راغب ہوں اور اس کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں۔

جب یہ خیال میرے دماغ میں آیا تو یک دم وہ مجھے بڑی تھرڈ کلاس لڑکی لگی جو مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہی اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی جو آج کل کی ہر لڑکی استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کچھ اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں لیکن بیشتر ناکام رہتی ہیں کیونکہ آج کا مرد اتنا بھولا نہیں ہے جتنا لڑکیوں نے سمجھ لیا ہے۔ بے نیازی جتانے کا یہ حربہ مردوں کا بہت پرانا اور آزمودہ حربہ رہا تھا جسے وہ اب آؤٹ آف ڈیٹ سمجھ کر چھوڑ چکے ہیں اور لڑکیوں نے اسے اپنا لیا ہے۔ سو مجھے خود پر بڑا افسوس ہوا کہ میں کیسے اس حربے

میں پھنس گیا ہوں اور ایک مجنوں کی طرح میں نے انگلش ڈیپارٹمنٹ جانا شروع کر دیا ہے۔

اگلے کچھ دن میں کالج جانے سے باز رہا لیکن پھر چند دن کے بعد پتا نہیں مجھے کیا سوجھی کہ میں نے پھر کالج جانا شروع کر دیا اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ انگلش ڈیپارٹمنٹ بھی، میں نے بہت کوشش کی کہ اسے نظر انداز کرنا شروع کر دوں بالکل ویسے ہی جیسے وہ مجھے کرتی ہے لیکن بس یہی ایک کام تھا جو میں نہیں کر پایا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے لیے مخالفانہ خیالات اور اس کے لیے میری کدورت بھک سے میرے دماغ سے غائب ہو گئی تھی۔ اپنی ساری انا، غیرت اور خود داری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے اس کا حال پوچھا تھا اور وہ I'm fine کہہ کر جوابی طور پر میرا حال پوچھے بغیر چلی گئی تھی میری ساری محنت کا حصول وہ مسکراہٹ تھی جو چند لمحوں کے لیے مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی اور پھر یہ سب روٹین کا حصہ بن گیا تھا۔

اس پر نظر پڑتے ہی میں کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس کی طرف بڑھ جاتا تھا اور ان ہی رسمی دعائیہ کلمات کے بعد وہ رکے بغیر چلی جاتی تھی اور مجھے اپنی اس حرکت پر بے حد طیش اور شرم محسوس ہوتی تھی لیکن صرف اس وقت تک جب تک وہ دوبارہ میرے سامنے نہیں آ جاتی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ مجھے پتا چلا کہ صرف میں ہی نہیں تھا جو اس کے پروانوں میں شامل تھا وہاں ستم رسیدہ اور بھی تھے اور ان میں ہر عمر اور ہر ایئر کے نوجوان شامل تھے اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ میرا عزیز ترین دوست عمر زبیری بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھا۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر خوشی محسوس ہوتی تھی کہ میں جب بھی عمر سے انگلش ڈیپارٹمنٹ جانے کے لیے کہتا ہوں وہ ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری دوستی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے مگر اس کا انکشاف بہت بعد میں ہوا کہ وہ اصل میں رابیل علی کو دیکھنے کے لیے وہاں جانے پر تیار ہو جاتا تھا۔ اگرچہ یہ اندازہ کبھی بھی نہیں ہو پایا کہ میں بھی اس کے رقیبوں میں شامل ہوں اور نہ ہی یہ انکشاف میں نے کرنے کی کوشش کی۔ یہ اسی کی بدولت تھا کہ مجھے ان دوسرے لڑکوں کے بارے میں پتا چلتا گیا جو رابیل علی کو دیکھنے کے لیے انگلش ڈیپارٹمنٹ جاتے تھے۔